اورینٹل کالج میگزین، جلد۹۹، شمارہ ۳، مسلسل شمارہ:۳۷۳، سال ۲۰۲۴ء

مرزا غالب کی آخری غزل: تفہیمی مطالعہ

مہرین شہزادی
بی ایس (اُردو)، گورنمنٹ گریجوایٹ تعلیم الاسلام کالج چناب نگر، چینوٹ
غلام رسول
وزٹنگ فیکلٹی، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ ڈگری کالج لالیاں، چینوٹ

LAST GHAZAL OF MIRZA GHALIB
A HERMENEUTICAL STUDY

Mehreen Shahzadi
Govt. Graduate Taleem ul Islam College, Chiniot
Ghulam Rasool
Visiting Faculty, Govt. Associate College, Lalian - Chiniot

Abstract

This paper is a hermeneutical study of Mirza Ghalib’s last Ghazal which is a reflection of tragic essence and the innovative vision of his life and self. This Ghazal is the summary of Ghalib's life as all verses describe tragic circumstances of different phases that Ghalib faced to prove himself as the greatest poet of Urdu literature. Poetic ideas of this Ghazal like sorrow, death, detachment, free will and predestination, misanthropy, existential sadness, passionate love and self awareness all are discussed through hermeneutic analysis helps to understand Ghalib’ tragic life, unique to himself, literary genius and personal greatness particularly in the context of his lifetime sufferings

Keywords:
Ghazal, tragedy, free will, predestination, self innovation

مرزا اسد اللہ خان غالب (۱۷۹۷ـ۱۸۶۹ء) ہند اسلامی تہذیب کی شعری روایت کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ آپ نے سبکِ ہندی کی فارسی روایت خصوصاً مرزا عبد القادر بیدل (۱۶۴۲ـ۱۷۲۰ء) کی شاعری اور اسلوب سے خوب استفادہ کیا۔ آپ نے سبکِ ہندی کے لازمی عناصر کو اُردو زبان میں برت کر دکھایا اور ایک منفرد اسلوب تخلیق کیا جو اُردو کی ادبی روایت میں اس سے پہلے موجود نہیں تھا۔ ایسے اسلوب کی ایجاد بلاشبہ غالب کا عظیم کارنامہ ہے جس کی وجہ سے غالب اُردو کی شعری روایت میں ہمیشہ ممتاز رہیں گے۔

آپ کے اس منفرد اسلوب کی سب سے بڑی خوبی "معنی آفرینی" ہے کیوں کہ غالب کے نزدیک شعر کہنا محض قافیہ پیمائی نہیں بل کہ اصل فن تو شعر میں معنی کی آفرینش کا تخیلاتی عمل ہے جو معنی کو وسعت عطا کرتا ہے۔ اس لیے آپ نے اپنی شاعری میں کہیں بھی مروجہ معنی پر اکتفا نہیں کیا اور نہ ہی لفظ کو اس کے روایتی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ آپ نے اُردو ادب کو معنی کے ایک خزانے سے نوازا ہے۔ غالب نے اپنے ذہن میں موجود کسی بھی مضمون یا تصور کو اس کے تمام مفاہیم اور امکانات کے ساتھ اپنی شاعری میں اس تہہ داری سے برت کر دکھایا ہے کہ جیسے ہی قاری شعر کے گہرے پرت کھولتا جاتا ہے تو اُس کے شعور میں نئے معنی ابھرتے جاتے ہیں۔ اس طرح شعر کی ہر پرت کھلنے پر معنی کی وسعت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور قاری کی عقل حیران رہ جاتی کہ کیسے اس کے اِدراک اور تخیل کی رسائی میں تنقیدی وسعت پیدا ہوگئی ہے بلاشبہ یہ غالب کے فن کی انتہا ہے کہ قاری کے ذہن میں معنی کی بیک وقت ایک سے زائد متحرک اور پیچ در پیچ صورتیں بنتی جاتیں ہیں اور یہ آپ کی معنی آفرینی کا امتیاز ہے کہ ایک سے زائد معنی کی جمالیاتی تشکیل بھی شعور کے پردے پر نمودار ہوتی جاتی ہے۔ غالب کے معنی آفرین ذہن نے اُردو شاعری میں معنی کی لسانی اور جمالیاتی تشکیل میں پختگی پیدا کرتے ہوئے اُردو ادب کو نایاب پیکر عطا کیے ہیں۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک ماہر مصور کی طرح غالب نے شعر کے کینوس پر لفظوں کے مُوقلم استعمال کرتے ہوئے معنی کے رنگوں سے خوب صورت پیکر تراشے جو بیک وقت متحرک ہونے کے ساتھ ندرتِ خیال کا بھی مرقع ہے۔ غالب اپنے ذہن میں موجود تمام معنوی صورتوں کو بھرپور انداز میں قاری کو دکھاتے ہیں اور ایسی ذہنی پیکر بناتے ہیں جو اس سے پہلے قاری کی دید کو میسر نہیں ہوتے۔ آپ کی اسی تخلیقی عظمت کی مثالیں آپکی اردو اور فارسی شاعری میں جابجا موجود ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کے دیوان کا پہلا شعر ملاحظہ کریں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا(۱)

غالب نے کس خوبصورتی اور مہارت سے مخلوقات کی وجودی صورتوں کو کاغذی پیرہن کہہ کر ان کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا انوکھا پیکر تخلیق کیا ہے اور یہ غالب ہی کے منفرد اسلوب کا خاصہ ہے۔ غالب

کی معنی آفرینی اور ان کے اسلوب کی انفرادیت کے پیچھے جو ذہنی قوت کار فرما ہے وہ قوتِ تخیل ہے۔ غالب تخیل سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے اِن کے معنی لفظ اور وقت کے امکانات کی قید سے آزاد ہیں۔ اسی آزادگی کی بدولت تازگی، آفاقیت اور عالمگیریت آپ کی شاعری کے نمایاں وصف ہیں۔ تخیل ذہن میں پہلے سے موجود تصورات کو استعمال کرتے ہوئے نئے پیکر تخلیق کرنا ہے۔ فرض کریں کہ آنکھ ایک کیمرہ ہے تو غالب پہلے سے موجود تصورات سے نئے خیالات کو اپنی چشمِ تخیل سے مصور کرتے ہیں۔ غالب کی زبان پر بے مثال دست رس خاص طور پر فارسی زبان پر گہرا عبور ایسی تمثال آفرینی، تشبیہ سازی اور ذہنی مورت گری کرتی ہے کہ جو پہلے سے کسی ذہن یا تحریر میں موجود نہیں ہوتی۔ یہی نہیں وہ سب صورتیں جو غالب اپنے اشعار میں مصور کرتے ہیں وہ اپنی نوعیت میں زیادہ تر متحرک ہوتیں ہیں اور قاری کے شعور میں گویا حاضر ہو جاتیں ہیں۔ مثال کے طور پر غالب نے شامِ فراق میں 'جوئے خون' کا آنکھوں سے بہنے کو 'شمع فروزاں' سے تشبیہ دی۔ یہ غالب کے تخیل کا ہی کمال ہے کہ اس سے پہلے شامِ فراق اور جوئے خون (بمعنی مسلسل آنسو) کے درمیان ایسی نسبت نہیں تھی جیسی غالب نے پیدا کر کے دکھادی۔

جدلیاتی وضع سے معنی پیدا کرنا غالب کے انفرادی اسلوب کا ایک اور امتیازی پہلو ہے یعنی غالب لفظوں میں موجود تضاد سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ آپ بسا اوقات ایسے الفاظ کو اکٹھا استعمال کرتے ہیں کہ جو معنی میں ایک دوسرے کا اُلٹ ہوتے ہیں لیکن وہ مل کر ایک دوسرے کے معنی کو پورا کرتے ہیں۔ غالب کے نزدیک 'حاضر' کا فہم اور اہمیت 'غائب' کے تصور کے بغیر ادھوری ہے۔ ایسے ہی ہر لفظ کا فہم اس کے متضاد لفظ کے استعمال سے زیادہ قابلِ فہم اور پُر اثر ہو جاتا ہے۔ ساختیات کے لسانی فلسفہ کے بانی بیسوی صدی کے مایہ ناز ماہرِ لسانیات اور فلسفی فرڈیننڈ ڈی سوسئیر (۱۸۵۷۔۱۹۱۳ء) اسی نظریے کے نمائندہ تھے کہ زبان مثبت اظہار سے خالی ہے اور الفاظ اپنے جوڑے دار متضاد الفاظ (binary opposites) کے ساتھ رشتہ میں جڑ کر معنی پیدا کرتے ہیں۔ غالب تضاد کے اس تعلق کو بطور فلسفہ اور فنی صنعت دونوں کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ممتاز ادبی نقاد گوپی چند نارنگ (۱۹۳۱۔۲۰۲۲ء) کے نزدیک غالب حرفِ نفی کو ظاہرَ استعمال نہ کر کے بھی تضاد سے معنی پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل شعر ملاحظہ کریں:

زمانہ سخت کم آزار نہیں بجانِ اسد وگرنہ ہم توقع زیادہ رکھتے تھے (۲)

غالب کی زمانے سے توقع پوری نہیں ہوئی۔ جتنے دکھوں کی انہیں امید تھی غالب کی ہمت کے آگے زمانہ غم دینے میں ناکام رہا۔ یہاں غالب نے مصائب سے شکوہ کی نفی کی ہے۔ سو یہ کہنا مناسب ہو گا کہ "جدلیاتی نفی کو حرفِ نفی کے بغیر شعر کی منعویت میں رواں دواں رکھنا اور معنی کا نیرنگ نظر قائم کرنا غالب کے معمولات میں ہے" (۳) پس غالب کے فنی محاسن کا ایک مقالے میں احاطہ کرنا ایک مشکل اَمر ہے

لیکن یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ غالب کی شاعری ایک ایسا چمن ہے جس میں ہر پھول اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اُردو کی شعری روایت میں ہر اعتبار سے اعلیٰ شاعر ہے جس کا بہترین اظہار آپ کی آخری غزل میں ہوتا ہے۔ معنی آفرینی' خیال آفرینی اور جدلیاتی وضع غالب کی آخری غزل میں اپنے نقطہ عروج پر نظر آتی ہے جس کا فکری جائزہ اور تعبیری مفہوم اس مقالے کا موضوع ہے۔

مرزا غالب کی آخری غزل نواب امین الدین احمد خان کے نام خط(۳مارچ۱۸۶۷ء) میں ملتی ہے۔ اس غزل کا ہر ایک شعر بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہر شعر غالب کی شاعری اور ان کے حالاتِ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ غزل ملاحظہ کریں:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار — گہ نالہء کشیدہ ، گہ اشک چکیدہ ہوں
جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ — میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
ہوں خاکسار ، پر نہ کسی سے مجھ کو لاگ — نے دانہ اُفتادہ ہوں ، نے دام چیدہ ہوں
جو چاہیے نہیں وہ میری قدرومنزلت — میں یوسفِ بقیمتِ اول بریدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے میری جگہ — ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں
اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عامیوں کے زمرے میں' میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد — ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں(۴)

یہ غزل گویا غالب کی زندگی کا حاصل ہے کہ جس میں آپ نے اپنی ذات کے خاص پہلوئوں کا ایسے احاطہ کیا ہے کہ فنِ شاعری' معنویت اور آپ کی شخصیت ایک دوسرے کو باہمی طور پر مکمل کر رہے ہیں۔ مطلع کی تفہیمی تعبیر ملاحظہ کریں:

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں(۵)

مفہوم: میری زندگی میں غم اتنا زیادہ ہے کہ کہیں بھول کر بھی آرام نہیں پا سکتا۔ میری حالت اس خوف زدہ ہرن کی طرح ہے جو کہ گھاس کھاتے وقت بھی جنگل میں شکاری کے خوف سے بار بار گردن اٹھا کر دیکھتا ہے اور بے چین ہے۔

اپنی وضع کے اعتبار سے دیکھیں تو اس شعر میں جدلیاتی گردش ہے یعنی نفی بہ نفی معنی پیدا ہو رہے ہیں۔ پہلے مصرعے میں 'نہیں' سے معنی پیدا کئے گئے ہیں۔ غالب فرماتے ہیں کہ میرا غم اتنا شدید ہے کہ میں سکون کا گماں ہی نہیں کر سکتا۔ اور اگر سکون نہیں تو یقیناً اضطراب ہے۔ لیکن اضطراب نے س طرح گھیر لیا ہے کہ میں حالتِ خوابیدگی میں بھی غم کو بھول کر اطمینان نہیں پا سکتا۔ غالب نے خود کو اس ' ہرن'

سے تشبیہ دی ہے جو جنگل میں گھاس کھاتے وقت بھی سکون نہیں لیتا بل کہ اضطراب کی کیفیت میں بار بار خوف سے اپنے شکاری کو دیکھتا رہتا ہے۔ غالب ایسے بے چین ہرن کی مانند ہیں جو کسی صورت بھی آرام نہیں پاتا۔ غالب نے اپنی زندگی کو 'دشتِ غم' کہا ہے جس میں غم نے اُن کا شکار کیا ہے۔ اس شعر میں غالب تصورِ غم کو بیان کرتے ہیں جو غالب کی شاعری کا زبردست محرک ہے۔ غالب کی زندگی اور غم لازم و ملزوم ہیں۔ غم کے بغیر تصورِ حیات بھی ممکن نہیں۔ جیسے ہی غم ختم ہو گا زندگی بھی اپنے اختتام کو پہنچے گی۔ آپ فرماتے ہیں:

قیدِ حیات و بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں(۶)

مطلع میں غالب کا جذبہ غم اس شدت کے ساتھ شعری سانچے میں ڈھل گیا ہے کہ کیفیتِ غم اور لفظ یکجا ہو گئے ہیں۔ غم کو زندگی کا بنیادی جذبہ قرار دینا غالب کی انسانی نفسیات پر زیرک نگاہ کی طرف واضح اشارہ ہے۔ غالب کی زندگی میں غم ختم نہیں ہوتا بلکہ "غالب کے یہاں غم کی مختلف شکلیں ہیں: کہیں غمِ روزگار، کہیں غمِ عشق، اور کبھی دائمی تمنا اور انتظار کا غم لیکن غمِ عشق کی بدولت غمِ روزگار سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔"(۷) غالب فرماتے ہیں:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہی　　غمِ عشق اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا(۸)

اپنے بھائی مرزا یوسف کو خط لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ کیا" پوچھو کہ غم کیا ہے؟ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت"(۹) غرض یہ کہ غالب کی زندگی کا کوئی پہلو بھی غم سے خالی نہیں تھا حتیٰ کہ اپنی ذات کے تصادم سے ہی غم ان کے لاشعور پر حاوی ہو گیا تھا۔ غزل کا دوسرا شعر ہے:

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو　　گہہ نالہ کشیدہ، گہہ اشکِ چکیدہ ہوں(۱۰)

مفہوم: میں بے بسی اور اختیار دونوں صورتوں میں غم کا مارا ہوا ہوں۔ کبھی میں درد کی وجہ سے نکلی ہوئی آہ و فریاد ہوں تو کبھی میں وہ آنسو ہوں جو درد کی شدت کے باعث بے اختیار آنکھوں سے نکل آتا ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں غالب فرماتے ہیں کہ غم زدہ اور دکھوں کا مارا ہوا ہوں۔ وہ جبر و اختیار کی متضاد کیفیات کا استعمال کرتے ہیں جو اس شعر میں صنعتِ تضاد کے طور استعمال ہوئیں ہیں۔ جبر سے مراد ظلم ہے یعنی زبردستی کی ایسی صورت کہ انسان مجبورِ محض ہے اور اسے کسی قسم کا اختیار حاصل نہیں اور ظلم اختیار کی ضد ہے۔ اختیار سے مراد کسی کام کے کرنے یا کسی فعل کی آزادی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ ہر صورت میں میری زندگی غم ہے۔ اگر میں با اختیار ہوں تو میرا اختیار صرف اتنا ہے کہ تڑپ سکوں اور چیخ و پکار کر سکوں۔ یعنی میں کبھی ایک آہ و فریاد ہوں اور کبھی بے بسی میں آنکھوں سے ٹپکتا آنسو کا قطرہ ہوں۔ اس شعر میں غالب نے انسان کی اِس عالم میں بے بسی اور بے چارگی کو بیان کیا ہے جو زندگی بھر کے رنج و اَلم اور

حسرتوں کی طلب میں تڑپنے کی وجہ سے زندگی کے آخری مرحلے میں غالب کے عالمِ تخیل اور عالمِ فکر کا حصہ بن گئی۔ غالب نے اس شعر میں مسئلہ جبر وقدر کے حوالے سے انسانی سرشت کو بہت عمدہ زبان میں بیان کیا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر یوسف حسین خان فرماتے ہیں کہ "اسلامی علم الکلام میں یہ بہت اہم مسئلہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں کہاں تک آزاد ہے اور کس قدر مجبور ہے۔ غالب کا خیال ہے کہ انسان اپنے عمل اور اپنے ارادوں میں مجبور ہے۔ اس لیے اُس کے عمل کی ذمہ داری اُس پر نہیں ہے۔"(۱۱)

جب غالب نے اپنی انفرادیت اور فکری بلندی کو پہچان لیا تو اپنے رتبے کے مطابق خواہش بھی بے قابو ہو گئی کیوں کہ ان کی توقعات بڑھ گئی۔ جب ان کی من چاہی خواہشات پوری نہ ہوئی تو ان کی طلب حسرت کی شکل اختیار کر گئی جس نے اِن کی زندگی میں دائمی غم کو جنم دیا۔ اور پھر اس طلب میں غالب نے جب کائنات کا جائزہ لیا تو خود کو بلکہ ہر انسان کو بے بس پایا۔ انسان کی اسی بے بسی کے تصور کے بارے میں سید ابولاعلی مودودی فرماتے ہیں کہ "انسان جب زیادہ گہری نظر سے ملکوت اور ارض و سماوت دیکھتا ہے اور مطالعے کی مدد سے اس زبردست نظام کے چلانے والے کی صفات کا تصور کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے دل و دماغ پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ اے انسان! تیری قدرت، تیرا علم اور تیرا ارادہ کوئی چیز نہیں۔ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کے سامنے انسان بالکل عاجز، بے بس اور درماندہ ہے۔"(۱۲) غالب کے اعلیٰ ذہن نے جب اس حقیقت کو محسوس کیا تو اس نے اپنی زندگی کو محض غم کا پیکر پایا کہ میری آزادی واختیار صرف اتنا ہے کہ جس قدر چاہوں آہ و پکار کر لوں۔ غالب کی زندگی غم کا پیکر ہے اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ "غالب کی دائمی خواہشیں ان کی دائمی حسرت کو جنم دیتی رہیں ہیں۔ یہ سلسلہ اسی طرح عمر بھر رہا اور وہ ہمیشہ غم و اندوہ میں مبتلا رہے۔ غم کے بغیر ان کا فن نامکمل رہتا"(۱۳) غالب کے مسلسل اور دائمی غم کی وجہ سے ہی ان کو وہ فعل جو بظاہر اختیاری ہے اپنے باطن میں اضطراری اور بے اختیاری لگتا ہے۔ اس لیے وہ غم کو زندگی کی اساس بتاتے ہیں جس کے بغیر کوئی بھی فعل نامکمل ہے۔ غزل کا تیسرا شعر ہے:

جان لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن　　　از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں(۱۴)

مفہوم: اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ وقتِ مرگ قریب آنے پر بھی میرے لہجے کی کڑواہٹ کم نہ ہوئی کیوں کہ میں نے جدائی کے غم کی شدت کا تجزیہ کیا ہوا ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ میری موت کا وقت قریب آن پہنچا ہے۔ یہاں دہن محض ہونٹوں کے کناروں کی طرف اشارہ نہیں بلکہ یہ لفظ ولہجہ اور اندازِ بیان کا استعارہ ہے۔ غالب کو تمام عمر اپنے اندازِ بیاں پر ناز رہا اور فکر میں انانیت کا عنصر ہمیشہ غالب رہا۔ مزید یہ کہ غم اور ہجر و فراق نے آپ کے لہجے میں سختی اور تلخی بھی پیدا کر دی تھی۔ حالتِ نزاع میں سخت سے سخت دل بھی نرم پڑ جاتا ہے لیکن غالب کہتے ہیں کہ

موت بھی میرے لہجے کی کڑواہٹ اور سختی کو کم نہیں کر سکی کیونکہ میں نے ساری زندگی بڑے دکھوں اور غموں کا سامنا کیا ہے حتیٰ کہ موت کا تجربہ ان کے سامنے حقیر ہے۔ غالب ہجر اور جدائی کے علاوہ دیگر غموں کو ہیچ تصور کرتے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں   شبِ فراق سے روزِ جزا زیادہ نہیں (۱۵)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدائی کی سختی بھی قیامت یا موت کی سختی کو نہ ہلا سکی۔ میرزا قاضی جنون کو لکھتے ہیں:

> "۱۲۷۷ ہجری میں میرا نہ مرنا صرف میری ہی تکذیب کے واسطے تھا مگر اس برس میں ہر روز مرگِ نو کا مزہ چکھتا رہا ہوں، حیران ہوں کہ کوئی صورتِ زیست نہیں؟ پھر کیوں جیتا ہوں۔ روح میری جسم میں اس طرح گھبراتی ہے جس طرح طائر قفس میں۔"(۱۶)

یعنی جس شخص نے ہر روز نئی موت کا مزہ چکھا ہو اس کو موت کسی صورت پریشان نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ اُس سے زیادہ درد سے آشنا ہے۔ ایک بار مر جانا ہر گھڑی کے زخم کی شدت سے بہتر اَمر ہے۔ اس ضمن میں میرزا غالب کے ایک خط کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> "سنو دو عالم ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔۔۔ ہرچند یہ عام ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم عالمِ اَرواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔"(۱۷)

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ میرزا غالب اس جہاں کی سختیوں کو دوسرے جہاں کی سختیوں سے زیادہ دردناک تصور کرتے ہیں۔ ایسی ہی سختی جدائی کا غم ہے۔ غزل کا چوتھا شعر ہے:

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ   میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں (۱۸)

مفہوم: میرا تسبیح اور جام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اس دنیا میں بے بس اور لاچار ہوں۔

اس شعر میں صنعتِ تضاد سے معنی پیدا کیے گئے ہیں۔ سبحہ اور ساغر کے درمیان نسبتِ معکوس ہے یعنی سبحہ اور ساغر میں تضاد کا تعلق پیدا کر کے دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ سبحہ اور ساغر دونوں علامتی لفظ ہیں۔ 'ساغر' سے مراد ہے 'جام یا شراب' جبکہ سبحہ سے مراد ہے 'تسبیح' تو ساغر گناہ یا بدی جبکہ سبحہ نیکی کی علامت ہے۔ غالب دونوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے جدلیاتی وضع سے اثبات پیدا کرتے ہیں کہ اُن کا اِن دونوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ سبحہ اور ساغر میں مشترک عنصر 'ہاتھ' ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'معرضِ مثال' کا مطلب ہے 'مثال کے ظاہر ہونے کی جگہ' یعنی 'دنیا' جبکہ 'دستِ بریدہ' ایک خیالی پیکر ہے اور ذات کے لیے اشارہ یا استعارہ ہے جو "بے دست و پا ہو" یعنی مجبور' بے بس اور لاچار ہو۔ یہاں 'معرضِ مثال' اور 'دستِ بریدہ' میں بھی نسبتِ معکوس پائی جاتی ہے۔ یعنی ہم انسان معرضِ مثال میں

ہیں۔ معرضِ مثال مکمل ترین صورت کے وجود میں آنے کا عالم ہے۔ غالب مکمل انسان کی صلاحیت لیے ہوئے بھی بے اختیار' مجبور اور بے بس ہیں اور بے چارگی کی شکل کو اس شعر میں بیان کر رہے ہیں۔ اسی لیے بقول شیما مجید "غالب کی شاعری کے مطالعے کے بعد اس کی تاثیر سے بچنا مشکل ہے کیونکہ انسان اطمینان سے محروم ہستی ہے اور یہی بے اطمینانی اس توازن کو درہم برہم کرنے کا باعث ہے جو کشمکش اور اس سے نجات پانے کی خواہش کے درمیان جاری ہے" (۱۹) اور اسی نجات پانے کی کشمکش میں غالب جب ناکام ہوتے ہیں تو بے چارگی اور بے بسی کے اظہار کے لیے 'دستِ بریدہ' کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔ انسان کے اس دنیا میں بے بس ہونے کے خیال میں غالب میر کے ہم خیال نظر آتے ہیں:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے خود مختاری کی جو چاہے سو آپ کرے ہم کو عبث بدنام کیا(۲۰)

یعنی غالب تسبیح اور جام سے لاتعلقی پر خود کو قصوروار نہیں ٹھہراتے کیونکہ وہ تو بے بس اور لاچار ہیں یعنی کوئی بھی عمل ان کے بس میں نہیں ہے۔ یعنی انسان (غالب) اس دنیا میں مجبور ہے اسی لیے اس کا سبحہ اور ساغر سے ہونا/نہ ہونا اُس کے اختیار میں نہیں۔" غالب کا خیال ہے کہ انسان اپنے عمل اور اپنے ارادے میں مجبور ہے۔ اسی لیے اس عمل کی ذمہ داری اس پر نہیں ہونی چاہیے"(۲۱) جب غم غالب کی زندگی پر ظاہر ہوتا ہے تو غالب اس کا سامنا کرنے کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے کام لیتے ہیں۔"سب سے پہلے تو انسان غم سے نجات چاہتا ہے جب ایسا نہیں کرپاتا تو پھر تڑپتا' چیختا اور چلاتا ہے۔ بقول غالب:

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں(۲۲)

ایک وقت کے بعد انسان اسی غم میں لذت محسوس کرتا ہے۔ بقول غالب

رنج سے خوگر ہو تو انسان تومٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑی مجھ پہ کہ آسان ہو گئیں (۲۳)

ضبطِ غم کے اتنے مراحل طے کرنے کے بعد اور عمر بھر ہر طرح کے غموں سے الجھنے کے بعد غالب نے یہی نتیجہ نکالا کہ انسان بے بس ہے۔ اس شعر میں غالب نے شراب سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے حالانکہ وہ شراب پیتے تھے۔ مرزا عبادت نہیں کرتے تھے تو خود کو ' دستِ بریدہ' یعنی لاچار ثابت کرکے اپنے عمل سے نجات حاصل کی ہے کہ اگر میں نے عبادت نہیں کی یا شراب بھی پی ہے تو اس میں میرا کوئی ارادی عنصر شامل نہیں کہ میں تو بے بس انسان ہوں۔ میرا ان دونوں چیزوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اپنے وجودی غم سے آگے نکلتے ہوئے "غالب نے مغل حکومت کی بساط الٹنے کا غم، حسینی تہذیب کے مٹنے کا غم، دہلی کی تباہی کا غم"(۲۴) اور زمانے کے ناساز گار ہونے کی فکر میں خود کو بے بس پایا۔ الغرض غالب نے

زندگی کے ہر پہلو میں خود کو بے بس پایا اور پورے عالم میں اپنی ذات کے بے بس ہونے کو تسلیم کر لیا۔ غزل کا پانچواں شعر ہے:

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ　　نے دانہ فتادہ ہوں، نے دام چیدہ ہوں (۲۵)

مفہوم: غالب کہتے ہیں کہ میں خاک پر پڑا ہوں۔ اگرچہ خاک میں بہت سی ایسی چیزیں پڑیں ہوتی ہیں جن کا خاک سا ہونا یا خاک پر ہونا محض نظروں کا دھوکا ہوتا ہے۔ جس طرح زمین پر دانہ اور جال دونوں پڑے ہوتے ہیں۔ وہ صرف دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں اور جال میں اس چال کے ذریعے ان کو پھسالیا جاتا ہے مگر میں وہ دونوں نہیں ہوں۔ میں تو عاجز ہوں۔ میری کسی سے بھی دشمنی نہیں۔

تمام عمر غالب کے مزاج میں انا پرستی رہی لیکن وہ صرف غم کا سامنا کرنے اور ہار نہ ماننے کی طاقت تھی۔ لیکن غالب کا مزاج در اصل عاجزانہ تھا۔ انہیں کسی اور سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی۔ بس تمام عمر وہ اپنی حسرتوں کے پیچھے بھاگتے رہے اور ان سے ملنے والے غموں کا سامنا کرتے رہے جن کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں انہوں نے اپنا ایک خاص اسلوب تیار کر لیا تھا کہ وہ غموں اور پریشانیوں کے سامنے جھکتے نہیں تھے لیکن ان میں پھر بھی عاجزی تھی جس کا سبب ان کا بے بس ہونے کا تصور بھی تھا۔ مرزا غالب خاک نشینی کو بہتر سمجھتے تھے۔ انہی اپنی حسرتوں کی طلب کے علاوہ کسی سے کوئی دشمنی نہ تھی اور نہ کوئی مطلب تھا۔ خاک نشینی پر فخر کے بارے میں غالب کا ایک شعر ہے:

نازشِ ایام خاکسر نشینی کیا کہوں　　پہلوئے اندیشہ وقفِ بستر سنجاب تھا (۲۶)

اگر دوسرے مصرعے کا جائزہ لیں تو غالب نے کہا ہے کہ نہ میں وہ دانہ ہوں جس کے فریب سے پرندوں کو زمین پر لایا جاتا ہے اور نہ میں وہ جال ہوں جو زمین پر ہوتا ہے لیکن آسمان میں اڑنے والے پرندو ں کو قید کر لیتا ہے۔ یعنی غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں بالکل ایسا نہیں ہوں۔ میرے اندر ایسا کوئی دھوکہ نہیں ہے۔ میں جس طرح ظاہری طور پر خاک نشین اور عاجز ہوں میرا باطن بھی اُسی طرح ہے کیونکہ مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ غالب اس دنیا کے فریب کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ جیسے غالب فرماتے ہیں:

بازیچہ اطفال ہے دنیا میرے آگے　　روتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے (۲۷)

غزل کا چھٹا شعر ہے:

جو چاہیے نہیں وہ میری قدر و منزلت　　میں یوسفِ بقیمتِ اول برید ہ ہوں (۲۸)

مفہوم: میں (غالب) جس عزت اور قدر و منزلت کا مستحق ہوں وہ مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ میں یوسف تو ہوں مگر اس حال میں ہوں کہ جب وہ کنویں سے نکالے گئے اور قافلے نے ایک درہم کے عوض بازارِ مصر میں بیچ دیا۔

اس شعر میں غالب نے نفی (جدلیاتی وضع) سے کلام میں اثبات پیدا کرتے ہوئے غمِ عزت اور غمِ شہرت کو تخیل کے بلند مرتبے پر بیان کیا۔ مرزا غالب حضرت یوسف علیہ اسلام کو بطور استعارہ باالکنایہ استعمال کیا ہے۔ ہماری شعری روایت میں حضرت یوسف علیہ السلام خوبصورتی اور حسن و جمال کا استعارہ ہیں۔ غالب نے اپنی تخیلاتی بلندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ اسلام کی ہستی کو بطور استعارہ استعمال کیا کہ جب آپ غلام تھے اور غلامی کی حالت میں زمانہ آپ کو پہچان نہ سکا اور نہ ہی آپ کو وہ مقام دے سکا جس کے آپ علیہ اسلام مستحق تھے۔ یہی معاملہ غالب کو درپیش تھا کہ اُن کی وہ قدر دانی نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ غالب کی ذات جس عزت کی حقدار تھی اس کے موازنے میں غالب کو ذلت ہی ملی۔ خود غالب کہتے ہیں:

گر مصیبت تھی غربت میں اٹھالیتے اسد　　　میری دہلی میں نہ ہوتی یہ خواری ہائے ہائے (۲۹)

مزید یہ کہ "عزت اور روزگار کے غم کے علاوہ غالب کو شہرت کا بھی غم تھا۔ وہ اپنی خاندانی برتری کے ساتھ اپنی قابلیت بھی دنیا سے منوانا چاہتے تھے" (۳۰) مرزا غالب کو اپنے زمانے میں وہ پذیرائی کبھی نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ غالب کچھ عرصہ قیدِ فرنگ میں بھی رہے۔ وہ مالی اور معاشی لحاظ سے بھی تنگ دست رہیں۔ غالب کا یہ شعر معنی آفرینی کی بھی عمدہ مثال ہے۔ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو غلام بنا کر بیچا گیا۔ ان کو قدر اور عزت نہیں ملی۔ اسی طرح غالب محسوس کرتے تھے کہ انہیں بھی عزت نہیں ملی۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو غلامی کے بعد بہت شہرت، حکمرانی اور عزت نصیب ہوئی۔ یعنی ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ جس طرح غلام یوسف کو مستقبل میں کامرانی نصیب ہوئی اسی طرح غالب سمجھتے تھے کہ انہیں بھی کامیابی نصیب ہوگی۔ غالب سمجھتے تھے کہ مجھے لوگ اب نہیں پہچان رہے لیکن میرے جوہر اور حکمت و دانش کے پہلو لوگوں پر مستقبل میں روشن ہوں گے جس طرح حضرت یوسف کے جوہر مستقبل میں روشن ہوئے۔ غزل کا ساتواں شعر کچھ یوں ہے:

ھر گز کسی کے دل میں نہیں ہے میری جگہ　　　ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں (۳۱)

مفہوم: ہر کسی کے دل میں میری جگہ نہیں ہے۔ میں وہ کلامِ نغمگی ہوں کہ جسے ابھی لوگوں نے سنا نہیں ہے۔

غالب کہتے ہیں لوگ میرے تخیل کی بلندی سے واقف نہیں ہیں اس لیے ہر کسی کے دل میں میری وہ قدر اور مقام نہیں جس کا میں حقدار ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ " جب تک غالب کی ذہنی الجھنوں کو نہ سمجھا جائے اُس وقت تک اُن کی شاعری کو سمجھنا دشوار ہیں۔ اگر زندگی کے اندرونی محرکات کو تھوڑا بہت سمجھ لیا جائے تو غالب کی شخصیت کے بہت سارے تاریک گوشے خود بخود روشن ہو جاتے ہیں" (۳۲)

گویاغالب کے کلام کو سمجھنے کے لیے غالب کی تخیلاتی بلندی اور ان کی زندگی کے حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔اس شعر میں ' شنیدہ' سے مراد محض کان سے سن لینا نہیں ہے یہاں ' شنیدہ' سے مراد کان سے سن کر دل میں اتار لینا یا تفہیم یعنی سماعت سے زیادہ تفہیم کو اہمیت حاصل ہے۔غالب فرماتے ہیں کہ لوگوں نے میرے نایاب اور نادر کلام کو صرف سماعت کی حد تک سن لیا ہے لیکن میرے کلام کو سمجھا نہیں۔میرا کلام سماعت کا نہیں بلکہ دل میں اتر جانے کا حقدار ہے۔اور جب تک لوگ میرے کلام کو نہیں سمجھنے گے اُن کے دل میں میری قدر نہیں پیدا ہو گی۔غالب کو اپنی عظمت کا بخوبی اندازہ تھا۔اپنی شاعرانہ عظمت کا مضمون غالب یوں بیان کرتے ہیں:

پایہ من جز بچشم من نہ آید در نظر　　　از بلندی اختر ام روشن نہ آید در نظر (۳۳)

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جو ستارے بہت اونچے ہوتے ہیں وہ نظر نہیں آتے

اس شعر میں غالب نے الفاظ و معنی کی تاثیر کو نازک خیالی سے پیش کیا ہے کہ لوگ میرے کلام کو سمجھ نہیں پاتے یعنی لوگ میرے تخیل کی بلندی تک پہنچ نہیں پاتے اس لیے میں عزت اور دلی قدر سے محروم ہوں۔غزل کا آٹھواں شعر کچھ یوں ہے:

اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل　　　پر عامیوں کے زمرے میں، میں برگزیدہ ہوں (۳۴)

مفہوم: میں مذہبی لوگوں کی نظر میں قابلِ عزت نہیں لیکن خطاکار مجھے بہت پسند کرتے ہیں۔میں (غالب) ان میں بہت مقبول ہوں۔

اس شعر میں مرزا غالب نے صنعتِ تضاد کے استعمال سے معنی پیدا کیے ہیں۔تضاد کے تعلق سے دو طرح کا مضمون پیدا ہوا ہے: اول یہ کہ عاجزی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرے میں 'عامی' لفظ بطور عاجزی کے استعمال کیا ہے اور اہلِ ورع وہ عبادت گزار ہیں جن کو خود پر ناز ہے۔ دوم یہ کہ آپ نے اپنا تجزیہ دو مختلف گروہوں میں کیا ہے۔ عامی سے مرادواقعی میں گناہ گار انسان ہے۔ دونوں مضمون ایسے باہمی تصادم میں ہیں کہ اصل معنی دھندلاہٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ اب اس شعر سے کون سا مضمون قبول کیا جائے اور کیا معنی پیدا ہونگے یہ قاری کے نقطہ نظر اور غالب شناسی پر منحصر ہے۔پہلا مضمون عاجزی کا ہے۔غالب کہتے ہیں کہ میں عبادت گزار طبقے میں بہت رُسوا ہوں کیونکہ میں عبادت نہیں کرتا بلکہ شراب پیتا ہوں۔اس لیے دین دار طبقہ مجھے بہت برا سمجھتا ہے۔" غالب رند مشرب تھے۔خود اپنے قول کے مطابق وہ آدھے مسلمان تھے۔ مرزا شراب پیتے تھے اور نماز روزہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔"(۳۵) چونکہ غالب مرزا بیدل سے متاثر تھے اور بیدل عاجزی کو انسان کی جوہری صفت مانتے تھے اس لیے ممکن ہے کہ یہاں عاجزی کا مضمون بیان ہوا ہے۔اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں (غالب)

بہت گناہ گار بندہ ہوں۔ تمام عمر خدا کی نافرمانی کی ہے۔ اسی لیے وہ لوگ جو اللہ کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں تمام عمر اس کی عبادت کرتے ہیں وہ بھی مجھے برا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ جنھوں نے میری طرح خدا کی نافرمانی کی ہے وہ مجھے برا نہیں سمجھتے کیونکہ وہ سب بھی یہی کرتے ہیں۔ اس لیے میں ان میں مشہور ہوں۔ لیکن ان دونوں مضامین میں غالب خود کی ذات کے لیے عاجزی کا مفہوم ہی بیان کرتے ہیں لیکن عامیوں کے طبقے کے لیے ایک مفہوم میں عاجز ہونے کے اور اہلِ وَرَع کے لیے ناز و غرور کے معنی آتے ہیں۔ جبکہ دوسرے مضمون میں ظاہری معنی ہیں یعنی کہ عامی خطاکار اور گناہ گار اور اہلِ وَرَع دین دار عبادت گزار اور نیک لوگ ہیں جن کو اپنی عبادت پر غرور ہے۔ غالب فرماتے ہیں:

یہ مسائلِ تصوف' یہ تیرا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا(۳٦)

اس شعر میں بھی انہیں دو مضامین کا اظہار ہے جو غالب کی شخصیت کا خاصہ ہیں۔ غزل کا نواں شعر کچھ یوں ہے۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں(۳۷)

مفہوم: میں آدم ذات سے اس قدر بیزار اور ڈرا ہوا ہوں کہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ایسے ڈر جاتا ہوں جیسے کتے کا کاٹا ہوا پانی سے ڈرتا ہے۔

سگ گزیدہ سے مراد وہ شخص ہے "جسے دیوانے کتے نے کاٹ لیا ہو' ایسے شخص کے جسم میں دیوانے کتے کا زہر سرایت کر جاتا ہے۔ ایسا شخص پانی سے ڈرتا ہے اور آئینے سے دور بھاگتا ہے کیونکہ مجھے (غالب) میرے ہم جنسوں نے سخت دکھ اور آزار پہنچایا ہے یعنی وہ ہمیشہ مجھے کاٹ کھانے کے درپہ رہتے ہیں۔ آئینہ دیکھنے سے ہم جنس اور ان کی دی ہوئی تمام ایذرسانیاں تازہ ہو جاتی ہیں"(۲۷) اور مردم گزیدہ سے مراد ہے وہ شخص" جسے آدمیوں سے حد درجہ آزار اور دکھ پہنچا ہو"(۳۸) اس شعر میں غالب نے ایک بار پھر صنعتِ تضاد کا استعمال کیا ہے اور نفی سے معنی پیدا کیے ہیں۔ پہلے مصرعے میں اسد (مرزا غالب کا تخلص) سے مراد شاعر خود ہے جس کے معنی 'شیر' کے ہیں اور دوسری طرف لفظ سگ گزیدہ ہے جس میں سگ سے مراد 'کتا' ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے الٹ ہیں۔ یہاں نفی کی حرکیات سے معنی پیدا کیے گئے ہیں۔ کیونکہ شیر کبھی بھی کتے سے نہیں ڈرے گا۔ غالب فرماتے ہیں کہ میں انسانوں سے اتنا سخت بیزار ہو گیا ہوں کہ میں چونکہ خود ایک انسان ہوں اس لیے آئینے میں خود کا عکس دیکھ کر ڈر جاتا ہوں۔ جس طرح کتے کا کاٹا پانی سے ڈر جاتا ہے ایسی ہی غالب دیگر انسانوں سے خوف زدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب خود اپنے ہی عکس سے ڈر جاتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی انسان ہیں۔ غالب کے خیال میں "انسانی کشمکش کے دو فریقوں میں ایک فریق کی انسانوں کے لیے وہ گہری محبت ہے جو سب انسانوں کو اپنی اپنی سطح سے بلند کر

سکے۔ اسی لیے غالب اپنی 'مردم گزیدگی' کا ذکر کرتے ہیں جو اس محبت کو ہمیشہ ڈرا دیتی ہے اور انسان کو اپنی ذات سے دور کر دیتی ہے۔ دوسرا فریق انسان کی ذہنی حقیقت پرستی یا دیانت ہے جو انسانی مسئلے کا کوئی آسان حل قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتی" (۳۹) یعنی غالب کی انسانوں کے لیے وہ گہری محبت ہے جو انسانی سطح کو بلند کر دے اور ان کے تخیل کو وسیع تر کر دے لیکن اس محبت نے غالب کو ڈرا دیا کیونکہ اِنہی انسانوں نے غالب کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا کہ غالب نے مردم گزیدگی کا ذکر کیا۔ اتنے مصائب جھیلنے کے بعد غالب مردم بیزار ہو گئے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میں اپنا عکس دیکھ کر بھی گھبرا جاتا ہوں۔

غزل کے تفہیمی مطالعے کے اختتام پر غالب کا ایک معنی خیز اور پُر تاثیر شعر ملاحظہ کریں جو غزل کے سیاق و سباق میں گویا اُسی کا حصہ دکھائی دیتا ہے۔

میں عندلیبِ گلشن ناآفریدہ ہوں   ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج (۴۰)

مفہوم: میں وہ اجنبی بلبل ہوں جس کا باغ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے فی الحال میں اس باغ کے پیدا ہونے کے بعد متوقع راحت کا تصور کرنے سے حاصل شدہ جان بخش حرارت کے زیرِ اثر نغمے الاپ رہا ہوں۔

یہ شعر بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں غالب نے پیشین گوئی کی ہے۔ غالب نے زندگی سے جو توقعات قائم کی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ غالب کے مقاصد اعلیٰ اور توقعات بہت بلند تھیں۔ اس لیے غالب ادنیٰ اور پست مقاصد سے سمجھوتے کے لیے کبھی تیار نہ تھے۔ اس سے پہلے بھی غالب نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جس رتبے' شہرت اور عزت کے وہ حق دار تھے وہ انہیں نصیب نہیں ہوئی۔ غالب کو اپنی عظمت کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی تخیلاتی بلندی سے ایک باغ کا تصور پیش کیا جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ نے خود کو اس باغ کا بلبل کہا جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ مستقبل میں ایک ایسا دور آئے گا جب لوگ میرے کلام کو سمجھ پائیں گے۔ اس وقت مجھے وہ مقام مل جائے گا جس کا میں حق دار ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> " غالب کی شاعری ماضی کی داستان نہ تھی بلکہ مستقبل کا نفسیاتی رجحان تھی جو اول اول ناموس سی چیز معلوم ہوتی تھی لیکن بعد میں وہی زمانے کی انتہائی تمنا قرار پائی۔ غالب چونکہ فطرتاً بڑا خود آگاہ شاعر تھا اس لیے وہ خود بھی ان پوشیدہ حقیقتوں اور اپنے اندر چھپے ہوئے امکانات سے واقف تھا۔ " (۴۱)

آج غالب کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے یعنی جس گلشن کا وجود صرف غالب کے تصور میں تھا وہ اب وجود میں آ چکا ہے۔ غالب کی شاعری سے نئے نئے موضوعات اور نت نئے مباحث جنم لے رہے ہیں۔ یوں شعور اور لاشعور کی سطح پر غالب کی تفہیم ہو رہی ہے۔

خلاصہِ غزل: غالب کی زندگی ایک المیہ ہے

غالب کی آخری غزل کی تفہیم و تعبیر واضح کرتی ہے کہ غالب کی زندگی ایک ' المیہ ' ہے۔ غالب کا المیہ عام انسان کا المیہ نہیں ہے۔ غالب کا تصورِ زندگی' تصورِ غم' غمِ عشق' غمِ روزگار' غمِ عزت اور غمِ شہرت سب عالمگیر نوعیت کے ہیں لیکن پھر بھی غالب کی زندگی رنج و مصائب اور دکھوں کا شکار رہی اور غالب نے جس طرح کی مشکلات میں ثابت قدم رہے یہ اُن ہی کا خاصہ ہے کیونکہ کوئی عام انسان ایسے مشکل حالات کا اس ثابت قدمی سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تو غالب کا المیہ عام آدمی کا المیہ نہیں ہے۔ اگر شیکسپئیر کے المیے کی بات کریں جس میں ہیرو اکثر مر جاتا ہے جیسے ہیملٹ (۱۶۰۳ء) میں کہانی کا ہیرو (ہیملٹ) اپنے باپ کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ساری کہانی میں حالات کا سامنا کرتے کرتے آخر کار خود مر جاتا ہے۔ ارسطو کی ٹریجڈی میں کہانی کے مرکزی کردار سے قسمت روٹھ جاتی ہے لیکن اس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ سوفوکلیز (Sophocles) کا ڈرامہ ایڈیپس ریکس (Oedipus Rex) ارسطوئی المیے کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس میں ہیرو کی قسمت اسے تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور کہانی کا اختتام بھی ہیرو کی ناکامی پر ہوتا ہے۔ ہیرو آخر میں اندھا ہو جاتا ہے لیکن اس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ غالب کی ٹریجڈی ارسطو کے المیہ کے قریب تر ہے لیکن یہ ارسطوئی ٹریجڈی نہیں ہے۔ ان سب المیوں کا بنیادی یعنی مشترک عنصر بڑے کردار کی ناکامی ہے۔ اس لحاظ سے غالب کی ٹریجڈی قدرے مختلف ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی زندگی کا اپنا الگ ہی المیہ ہے۔ غالب کی زندگی نے ایک نئے المیے کو جنم دیا ہے۔ یہ غزل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ غالب کی تمام زندگی ایک المیہ ہے۔ غم اور ضبطِ غم کی کشمکش میں غالب کا اپنی عظمت کو جان لینا اور قائم رکھنا حیرت انگیز ہے۔ غالب ایک ٹریجک کردار ہے۔ اپنی زندگی میں ناکام رہنے کے بعد غالب کی "عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ" کی پشین گوئی پوری ہوئی۔ غالب آج زندہ ہے اور آج کی کامیابی اور کامرانی سے غالب اُس وقت بھی خوش تھے۔ "ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کی ٹریجڈی ایسی ٹریجڈی ہے جس میں غالب نے تمام عمر مصائب کا سامنا کیا لیکن آخر کار کو وہ کامیاب ہو گیا۔ ہیرو جیت گیا لیکن المیہ یہ ہے کہ ہیرو بعد المرگ جیت گیا۔ آج مشرقی شعری روایت میں غالب ایک عہد ساز شاعر اور نایاب شخصیت کے طور پر جانے جاتے ہیں۔

الحاصل غالب کی آخری غزل آپ کی پوری زندگی اور آپ کے حالِ وجود کی سچی آئینہ دار ہے۔ اس غزل میں آپ کی زندگی کا بنیادی عنصر غم ہے آپ کے نزدیک غم اور زندگی لازم و ملزوم ہیں۔ عہدِ غالب کے لوگ اپنے شاعرانہ ذوق کے باوجود غالب کے تخیل اور معنی آفرینی تک رسائی حاصل نہ کر پائے لیکن آخر میں غالب ہی سُرخرو ہوئے کہ عہدِ عصر عہدِ غالب ہے۔ آنے والا دور بھی غالب کی فنی و تخلیقی عظمت سے منسوب رہے گا اور اردو ادب کی تاریخ میں آپ ہمیشہ ایک عظیم ترین شاعر کے طور پر جانے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) یوسف سلیم چشتی، شرح دیوانِ غالب،(نئی دہلی: اعتقاد پبلشنگ ہائوس، ۱۹۹۲ء)، ۲۳۰۔

(۲) گوپی چند نارنگ، غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شیونیتا اور شعریات،(لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ۳۲۰۔

(۳) ایضاً، ۳۲۱۔

(۴) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، (لاہور: مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء)، ۱: ۲۳۴۔

(۵) ایضاً۔

(۶) مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب،(نئی دہلی: انجمنِ ترقی اردو ہند، ۱۹۹۹ء)، ۸۹۔

(۷) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب،(نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۱۹۶۸ء)، ۲۵۰۔

(۸) ایضاً۔

(۹) طاہر تونسوی، غالب شناسی اور الزبیر،(لاہور: مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۱۴ء)، ۲۲۶۔

(۱۰) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، ۱: ۲۳۴۔

(۱۱) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب،(نئی دہلی: غالب اکیڈمی، ۱۹۶۸ء)، ۴۸۔

(۱۲) سید ابوالاعلیٰ مودودی، مسئلہ جبر و قدر،(دہلی: تاج پریس، ۱۹۷۹ء)، ۲۸۔

(۱۳) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۱۸۶۔

(۱۴) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، ۱: ۲۳۴۔

(۱۵) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۱۹۴۔

(۱۶) غالب: فکر و فن، مرتب شعبہ اردو،(گورکھپور: گورکھپور یونیورسٹی، ۱۹۷۰ء)، ۴۹۔

(۱۷) ایضاً، ۲۷۔

(۱۸) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، ۱: ۲۳۴۔

(۱۹) شیما مجید، مقالاتِ ن م راشد،(اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ، ۲۰۰۲ء)، ۲۷۳۔

(۲۰) میر تقی میر، کلیات میر، ترتیب و تدوین ڈاکٹر عبادت بریلوی،(لاہور: اردو دنیا، ۱۹۵۸ء)، ۱۰۵۔

(۲۱) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۵۷

(۲۲) مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب،(نئی دہلی: انجمنِ ترقی اردو ہند، ۱۹۹۹ء)، ۸۹۔

(۲۳) مرزا اسد اللہ خان غالب، دیوانِ غالب،(علی گڑھ: مکتبہ الفاظ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء)، ۱۱۸۔

(۲۴) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۹۰

(۲۵) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، ۱: ۲۳۵۔

(۲۶) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۳۰۲۔

(۲۷) مرزا غالب، دیوانِ غالب،(علی گڑھ: مکتبہ الفاظ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء)

(۲۸) اسد اللہ غالب، خطوط غالب، ۱: ۲۳۵۔

(۲۹) گوپی چند نارنگ، غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شیونیتا اور شعریات، ۲۸۵۔

(۳۰) یوسف حسین خان، غالب اور آہنگِ غالب، ۹۰۔

(۳۱) **اسد اللہ غالب**، خطوط غالب ،۱:۲۳۵۔

(۳۲) **یوسف حسین خان**، غالب اور آہنگِ غالب،۹۰۔

(۳۳) **ایضاً**،۴۵۔

(۳۴) **اسد اللہ غالب**، خطوط غالب ،۱: ۲۳۵۔

(۳۵) **طاہر تونسوی**، غالب شناسی اورالزبیر،۱۶۰۔

(۳۶) **مرزا غالب**، دیوانِ غالب،(علی گڑھ: مکتبہ الفاظ مسلم یونیورسٹی،۱۹۸۰ء)، ۴۷۔

(۳۷) **اسد اللہ غالب**، خطوط غالب ،۱:۲۳۵۔

(۳۸) **غلام رسول مہر**، فرہنگِ غالب،(کراچی: اردو لغت بورڈ،۲۰۱۹ء)،۷۰۔

(۳۹) **شیما مجید**،مقالاتِ ن م راشد، (اسلام آباد: الحمرا پبلشنگ،۲۰۰۲ء)،۲۰۳۔

(۴۰) **اسد اللہ خان غالب**، دیوانِ غالب،(دہلی: انسٹی ٹیوٹ دہلی،۱۹۹۷ء)،۲۴۰۔

(۴۱) **طاہر تونسوی**، غالب شناسی اورالزبیر، ۲۷۶۔

BIBLIOGRAPHY

- Ghalib, Mirza Asadullah Khan, *Dīvāna-e Ghālib*, (Dilhi: Anjuman Taraqqi Urdu, 1999).
- Ghalib, Mirza, *Dīvāna-e Ghālib*, (Aligarh: Maktaba-i alfaz, Muslim University, 1980).
- Ibadat Barelvi (Edi.), *Kulliyāt-i Mīr*, (Karachi: Urdu Dunya, 1958).
- Jain, Gian Chand, *Rumūz-i Ghālib*, (New Delhi, India: Maktaba Jamia Limited, 2011).
- Khan, Yousuf Husain, *Ghālib aur ahang-i Ghālib*, (New Dihli: Ghalib Academy, 1968).
- Mawdudi, Sayyid Abul Ala, *Mas'lah-yi jabr o qadr*, (Lahore: Markazi Maktabah-i Jama at-i Islami, 1953).
- Mihr, Ghulam Rasil (Edi.), *Khutūt-i Ghālib*, Vol 1, (Lahore: Matbooat-e-Majlas-e-Yadgar-e-Ghalib Punjab University, 1969).
- Mihr, Ghulam Rasül, *Farhang-i Ghālib*, (Karachi: Urdu Lughat Board, 2019).
- Narang, Gopi Chand, *Ghalib: ma'nī āfrīnī, jadliyātī vaza, shūnyatā aur shi'riyāt*, (New Dihli: Sahityah Acadami, 2013).
- Sheema Majid, *Muqālāt-i N.M. Rashid*, (Islamabad: Al-Hamra Publishing, 2002) Shu-bah-yi Urdu (Edi.) Ghalib: fikr o fan, Gorakhpur University, Gorakhpur, 1970
- Tahir Taunsvi (Edi.), *Ghālib Shanāsī aur Nakhlistān-i adab*, (New Dihli: Ghalib Academy, 2006)

❖❖❖